تعمیری، خلاقیت سے بھرپور اور ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔ اس فعلیت میں مادی سطح، ذی حیات جانوروں کی سطح پر یا انسانی سطح پر جب کوئی چیز مانع ہوتی ہے اور اس کے ارتقائی عمل میں رکاوٹ بنتی ہے تو اسے سختی کے ساتھ علیحدہ کر دیا جاتا ہے تاکہ تخلیقی عمل کی ترقی بدستور جاری رہ سکے۔ ارتقاء کی راہ سے ان رکاوٹوں کے دُور کیے جانے میں اللہ تعالیٰ کے غیض و غضب اور انتقام کی صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ عذابِ استیصال، سماوی آفات و تکالیف اور قوموں کی سطح پر تباہی و بربادی اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

## ناپسندیدگی محبّت ہی کا ایک پہلو ہے:

ناپسندیدگی محبت اور چاہت ہی کا ایک پہلو ہے۔ جہاں کہیں محبت کا جذبہ ہوتا ہے وہاں ناپسندیدگی کا جذبہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ جذبہ محبّت کو اپنے مخالف سے لازمی طور پر کد ہوتی ہے حسن کی ہر صفت کا ایک مخالف ہوتا ہے۔ اس مخالف یا ضد کے بغیر خود اسے مثبت طور پر جانا اور حقیقت کا روپ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ بُرائی، ظلم اور کذب سے نفرت کیے بغیر کوئی شخص اخلاقی فضیلت، انصاف اور حق سے محبت نہیں کر سکتا۔ خالقِ حقیقی کو جب بعض صفاتِ حسنہ مثلاً محبّت سے متصف کیا جاتا ہے تو ہم ساتھ ہی اس کو اس کی مخالف اور متضاد صفات سے بھی متصف کرتے ہیں۔ محبت اپنی ضد سے شدید نفرت اور دشمنی کے بغیر سچّی محبت نہیں ہوتی۔ تاہم اگرچہ مخاصمت اور ناپسندیدگی محبت ہی کا جزو ہے، یہ محبّت کے اظہار کا منفی پہلو ہے۔ منفی پہلوؤں کا اظہار راہِ محبت میں رکاوٹوں کے دُور کیے جانے کی صورت میں ہی ہوتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ پوشیدہ رہتے ہیں۔ جوں جوں جذبۂ محبت پروان چڑھتا ہے اور اسی میں بالیدگی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ناپسندیدگی کا جذبہ اتنا ہی کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے جہاں اس کی ضرورت قطعاً نہیں رہتی۔

## غضبِ خداوندی کے اظہار کے مواقع:

خداوندی خفگی کی جملہ صورتیں انسانیت کی فلاح اور بہتری کے لیے اس دنیا میں اُس وقت ظہور پذیر ہوتی ہیں جب کچھ لوگوں کے اعتقادات اور عمل عمومی ارتقاء میں حائل ہوتے ہیں۔

اوران کا مقصد ان بداعتقاد اور بدعمل لوگوں کی اصلاح اور خدائی نظم وعمل سے ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے بعنوانِ آیاتِ قرآنیہ:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ (السّجدة: ۲۱)

اور ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے قریب کے عذاب کا مزہ بھی چکھاتے رہیں گے، شاید کہ یہ (ہماری طرف) لوٹ آئیں۔

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا۔ (النسآء: ۱۴۷)

اگر تم (اللہ کی نعمتوں کا) شکر کرو اور (اس پر) ایمان رکھو تو اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا! اور اللہ تو قدر شناس (اور) جاننے والا ہے۔

فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا۔ (الانعام: ۴۳)

پھر جب ان پر ہماری (طرف سے) سختی آئی تو وہ کیوں نہیں گڑگڑاتے؟

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ۔ (التوبہ: ۱۲۶)

کیا یہ دیکھتے نہیں کہ یہ ہر سال ایک یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ پھر بھی نہ تو توبہ ہی کرتے ہیں اور نہ نصیحت ہی پکڑتے ہیں۔

اگر ہمارے نظریات اور عملی رویے غلط ہوں اور خدائی سکیم کے ارتقا میں حارج ہوں تو خالقِ حقیقی کی سزا ان میں بالقویٰ موجود ہوتی ہے۔ غلط سوچ اور بدعملی والے لوگوں کو جلد یا بدیر قوانینِ فطرت کے ہاتھوں اپنے کیے کی سزا مل کر رہتی ہے اور یوں انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر خدا کی سزا انہیں گھیر لیتی ہے۔ اگر وہ عذاب کے کوڑوں سے آنکھیں کھول لیتے ہیں اور عقیدے اور عمل کی اصلاح کر لیتے ہیں تو خالقِ حقیقی کی محبت اور انعامات کے مستحق بن جاتے ہیں۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ

غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ۔ (آل عمران : ۸۹)

مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور (اپنی) اصلاح کرلی تو یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

جب افراد اور قومیں اپنی اصلاح کرکے صحیح نصب العین کی طرف رجوع نہیں کرتیں اور اللہ کی طرف سے مہلت بھی ختم ہوجائے تو پھر انہیں مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ تاریخ میں بہت سی اقوام کی مکمل ہلاکت کا یہی سبب تھا۔ ان اقوام اور تہذیب کے باسیوں نے غلط نصب العین کے انتخاب اور بدعملیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو اللہ کے عذابِ استیصال کا مستحق بنالیا تھا۔

اَلَمۡ یَرَوۡا کَمۡ اَهۡلَکۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ اَنَّهُمۡ اِلَیۡهِمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ۔ (یٰسٓ : ۳۱)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی نسلوں کو ہلاک کر دیا تھا کہ اب وہ ان کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گی ؟

وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرۡیَةٍ اَهۡلَکۡنٰهَاۤ اَنَّهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ۔ (الانبیآء : ۹۵)

اور جس بستی (والوں) کو ہم نے ہلاک کر دیا اُن کے لیے (پلٹنا) محال ہے، وہ پلٹ نہیں سکیں گے

دنیا میں ان اقوام و ملل کے کھنڈرات اور نشانات اب بھی دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے عبرت کا سامان ہیں۔ اور ہر سوچنے اور غور کرنے والے ذہن کے لیے دعوتِ فکر ہیں کہ آخر ان کی تباہی و بربادی کا سبب کیا ہوا۔ اور وہ کیوں نسیاً منسیاً کر دیتے گئے۔ قرآن بصراحت اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ان کی بربادی غلط نصب العین کو اختیار کرنے اور اعمالِ بد کی وجہ سے ہوئی :

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ کَانَ اَکۡثَرُهُمۡ مُّشۡرِکِیۡنَ۔ (الروم : ۴۲)

(اے نبیؐ : ان سے) کہہ دیجئے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ (تم سے) پہلے ہو گزرے ہیں اُن کا کیسا انجام ہوا ہے۔ اُن میں سے زیادہ تر مشرک ہی تھے۔

جس طرح ایک عقلمند باغبان درختوں کے اردگرد سے اور پھولوں کی کیاریوں سے

جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی اس لیے کرتا ہے کہ زمین، مٹی اور کھاد کی قوتِ مطلوبہ پودوں اور پھولوں کو ملے اسی طرح خالقِ کائنات اس صفحۂ ہستی سے باطل نظریات کی حامل قوموں کو ختم کرکے صحیح نصب العین کا انتخاب کرنے والے نیکوکاروں کے لیے جگہ بناتا ہے۔ اور انہیں زمین میں تمکن عطا کرتا ہے :

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨ اجْتُثَّتْ
مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ۔ (ابراہیم:۲۶)

اور کلمۂ خبیثہ (باطل نظریہ) کی مثال ایک خراب درخت کی سی ہے کہ زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔ اس کو ذرا بھی قرار (و ثبات) نہیں۔

## ہر قوم کو اصلاح کی مہلت دی جاتی ہے :

خواہ کسی قوم یا تمدن کا نصب العین صحیح ہو یا غلط، اسے اپنی ذہنی، اخلاقی اور مادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور انہیں پروان چڑھانے کی پوری مہلت دی جاتی ہے۔ جب صورت یہ ہو کہ اس کی تمام تر صلاحیتیں مطلوبہ انسانی ارتقا میں منفی طور پر حائل ہوں تو پھر خالقِ کائنات کی طرف سے اس کے خاتمے کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے فطری نمو کی تمام صلاحیتیں ختم کر لینے کے بعد اس میں زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ تنزل اور انحطاط کے درجہ بدرجہ مراحل سے گزرتے ہوتے یہ قوم بالکلیہ صفحۂ ہستی سے ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی تہذیب لے لیتی ہے :

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ
وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۲۰)

(اے پیغمبرؐ) ہم اِن کو اور اُن کو سب کو تمہارے پروردگار کی بخشش سے مدد دیتے ہیں۔ اور تمہارے پروردگار کی بخشش (کسی سے) رُکی ہوئی نہیں۔

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الاعراف: ۱۸۲)

ہم انہیں بتدریج (عذاب کی طرف) اس طرح گھیر لائیں گے کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی۔

ان آیاتِ قرآنیہ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ کسی تہذیب کی موجودہ عظمت و بڑائی خواہ وہ کئی صدیوں پر محیط ہو، اس بات کی ضامن نہیں ہے کہ اس کی نظریاتی بنیادیں

صحت وسلامتی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ۔ (ابراہیم: ۳۰)

(اے نبیؐ! اِن سے) کہہ دیجئے کہ (چند روز) عیش کر لو، پھر بالآخر تمہارا لوٹنا دوزخ ہی کی طرف ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (الحجر: ۸۸)

ہم نے اِن (کافروں) کی کئی جماعتوں کو جو (متاعِ دنیا سے) بہرہ مند کیا ہے تم اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو!

چنانچہ اگر کوئی تہذیب غلط نصب العین اور باطل نظریۂ حیات پر استوار ہے تو اسے جلد یا بدیر ختم ہی ہونا ہے۔ صرف اسی تہذیب اور قوم کی صلاحیتیں ہمیشہ قائم و دائم رہنے والی ہیں جس کے نظریات صحیح نصب العین یعنی خدائے برتر و بزرگ کے یقین پر مبنی ہیں۔ صرف انہی تہذیبوں میں ارتقار کے ناقابلِ شمار اوصاف ہوتے ہیں۔ تمام باطل نظریات رکھنے والی تہذیبیں یکے بعد دیگرے اس مکمل اور ہمہ گیر عالمی تہذیب کے لیے جگہ بنانے کے لیے معدوم ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اور مضبوط اور شاخیں بلند و بالا اور تر و تازہ ہیں اور وہ سال بھر ثمر بار رہتا ہے:

مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا
ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ
بِاِذْنِ رَبِّهَا ط (ابراہیم: ۲۴-۲۵)

کلمۂ طیبہ (نظریۂ توحید) کی مثال ایسے ہے جیسے ایک اچھا درخت جس کی جڑ (زمین میں) جمی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں ہوں۔ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر موسم میں پھل لاتا رہتا ہو

## انسانی خودی کی تمام اچھی صفات، صفاتِ الٰہیہ کا پرتو ہیں:

خدائے عزّ وجل کی اہم ترین صفت کی طرح انسانی خودی کی مرکزی اور اہم ترین صفت بھی محبّت اور رحیمیّت ہے۔ باقی تمام صفات صفتِ محبت کے تحت آتی ہیں یا اس کے مختلف پہلو ہیں۔ چونکہ انسانی خودی کی تمام اچھی صفات کا منبع و سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہیں

اسی لیے خدا کی صفتِ محبت کی طرح انسانی سطح پر بھی اخلاقی فضائل اور محاسن میں صفتِ محبت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس طور انسان صفاتِ الٰہیہ ہی کا ایک بہت چھوٹے پیمانے پر عکس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قولِ مبارک ہے:

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ۔

بے شک اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

اور یہی سبب ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اللہ کے نمائندے اور خلیفہ کی حیثیت میں یہ اس کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ خدائی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرے اور نہ صرف اپنی بلکہ پوری بنی نوعِ انسانی کی روحانی ترقی کے لیے بھرپور جدوجہد کرے اور کمال کے مطلوبہ نقطۂ عروج تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ خلافتِ ارضی کی صراحت مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں ملتی ہے:

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ (البقرۃ: ۳۰)

جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں (اپنا) ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

انسان خلافتِ ارضی کے تقاضے پورے کر کے اپنی باطنی صلاحیتوں کو نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ انہیں پورے طور پر ترقی کے مواقع بھی بہم پہنچاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح ان تقاضوں کو پورا کرنا اس کے اپنے فائدے میں ہے۔ خلافتِ ارضی کے اخلاقی اور روحانی تقاضوں کی تکمیل کو خالقِ کائنات نے اپنی نصرت و مدد سے تعبیر فرمایا ہے۔ اور صلے کے طور پر نہ صرف روحانی و نفسیاتی بلکہ مادی انعامات کی وعید سنائی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ۔ (محمد: ۷)

اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔

اللہ کی عنایات اور اس کے انعامات حقیقت یہ ہے کہ اس کائناتی ارتقائی عمل ہی کا حصہ ہیں جو خالقِ کائنات نے مقرر فرمایا ہے اور جو کوئی قوم اور اجتماعِ انسانی اس عمل کو اختیار کر کے اس کی تقویت کا باعث بنتا ہے وہ از خود ان سے متمتع ہوتا ہے۔ ان انعامات میں سے

وہ اہم انعام جو باقی سب پر حاوی ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ قوم رُوئے ارضی پر تمکن اور غلبہ حاصل کرتی ہے اور مخالف نظریہ ہائے حیات پر فتح حاصل کر کے دنیا میں مستقل طور پر قائم رہتی ہے۔ اس حقیقت کا بیان مندرجہ ذیل دو آیاتِ قرآنیہ میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (المنٰفقون: ۸)

اور عزت تو اللہ اور اس کے رسُول اور مومنوں کے لیے ہے

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (آلِ عمران: ۱۳۹)

اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن (صادق) ہو۔

## نفرت و مخالفت صرف صحیح محبّت کے لیے روا ہے:

نفرت و مخالفت صرف اس وقت جائز ہیں جب وہ صحیح محبّت کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیے ناگزیر ہوں۔ چونکہ انسان کا اصل مقصد محبّتِ الٰہی ہے، اس لیے جب اس کا جذبۂ عشق و محبّت صحیح رُخ پر ہوتا ہے تو وہ ہر اس چیز سے محبّت کرتا ہے جس سے اللہ محبّت کرتا ہے، اور ہر اس چیز سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ نفرت کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس کائنات میں خالقِ حقیقی کے ساتھ شریکِ فاعل کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ ہر اس شخص سے جنگ کرتا ہے جو خالقِ حقیقی کی مجوزہ سکیم میں باغیانہ روش رکھتا ہے۔ یہ باغی حسن، اچھائی اور حق کو پامال کرتے ہوئے اس راہ کو مسدود کرتا ہے جس پر چل کر قافلۂ انسانیت اپنی معراج حاصل کر سکتا ہے۔ حق و باطل کی اسی کشمکش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم دیا کہ:

مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ وَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ وَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ (رواہ مسلم)

تم میں سے جو کوئی بھی کسی بُرائی (کا ارتکاب ہوتے) دیکھے تو اسے اپنے زورِ بازو سے روک دے، اور اگر یہ نہ کر سکے تو اپنی زبان سے (اس کے خلاف آواز اٹھاتے) اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اپنے دِل سے (اسے بُرا سمجھے)۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ گناہ اور معصیت کو دیکھ کر ایک سلیم الفطرت اور مومن انسان کی حمیت جوش

میں آتی ہے اور اس طرح خدا اپنے ان بندوں کے ذریعے باطل کی سرکوبی کا بندوبست کرتا ہے:

يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ (التوبہ: ۱۴)

اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں عذاب دے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ (التوبہ: ۳۸)

اے اہلِ ایمان تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جنگ کے لیے) نکلو تو تم بوجھل ہو کر زمین پر گرے جاتے ہو۔

## حق کے لیے کشمکش (جہاد)

حقیقی ایمان والے راست باز انسان کا لازمی شیوہ ہوتا ہے کہ وہ تمام طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے اور ان سے مسلسل کشمکش رکھتا ہے۔ اسلامی اصطلاحات میں اس کوشش اور کشمکش کو "جہاد" کہتے ہیں۔ موقع و محل کی مناسبت سے یہ کشمکش اور باطل کی مخالفت نسبتاً نرم رویے کے ساتھ اور تشدّد آمیز دونوں طرح سے ہو سکتی ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ (الفتح: 29)

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (مگر) آپس میں رحم دل ہیں۔

وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ (التوبہ: ۱۲۳)

اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔

وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ (التوبہ: ۷۳)

اور ان کے مقابلے میں سختی کا رویّہ اختیار کرو۔

وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (التوبہ: ۴۱)

اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ (التوبہ: ۱۱۱)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے بہشت (کی دائمی زندگی) ہو۔

حق کے لیے حمیت اور باطل سے نفرت مردِ مومن کی خاص صفت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس صفت کو اس کی دوسری صفات بالخصوص محبت و رحمت سے کوئی بُعد نہیں۔ بلکہ اوّل الذکر مؤخر الذکر ہی کا ایک پہلو ہے۔ مردِ مومن خود ناگزیر حالات ہی میں مسلح تصادم کا آغاز کرتا ہے اور یہ مرحلہ اس وقت آتا ہے جب باطل کی ریشہ دوانیوں کو ختم کرنا ازبس ضروری ہو جائے۔ چنانچہ جب تک بالفعل حق کو عالمگیر غلبہ حاصل نہیں ہو جاتا، کوئی نہ کوئی باطل نظریہ یا مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر انسانوں کو گمراہی کی راہ پر چلا کر اخلاقی و روحانی طور پر کمزور کرتا رہے گا۔ حسنِ ازل کے پرستار اور محبِّ باطل کے پھیلاؤ کو سختی سے روکتے ہیں۔ جوں جوں دنیا حق کو اپناتی چلی جائے گی، نیک اور مومن حضرات کی مخالفت اور نفرت بھی خود بخود کم ہوتی جائے گی۔ خالقِ حقیقی سے محبت و عشق کی لازمی شرط عمل اور سعی پیہم ہے۔ اور یہ عمل اور جد و جہد اگر محدود پیمانے پر رہتا ہے اور اس کا دائرہ وسیع نہیں ہوتا تو اس کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ ایک عزمِ مصمم اور جذبۂ جہاد رکھنے والا مومن اپنی خودی کے مزید استحکام کے لیے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کی بھرپور اور وسیع پیمانے پر کوشش کرتا ہے۔ اس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ یہ نصب العین اور اس کا حصول اسے ہر دوسری چیز پر مقدم ہوتا ہے اور زندگی کے تمام مشاغل اسی حوالے سے طے پاتے ہیں۔ اگر وہ جزوی طور پر کچھ دوسرے نصب العینوں کو بھی محبوب رکھتا ہے تو اس کے قلب و دماغ کی کچھ صلاحیتیں ان کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ صحیح نصب العین کا حق اس صورت میں کما حقہٗ پورا نہیں ہو سکتا۔ یعنی ایسے شخص کی وفاداریاں منقسم ہو کر خود اس کی ذہنی یکسوئی ختم کر دیتی ہیں۔

# جبلّی خواہشات کی مناسب تسکین انسانی ارتقا میں ممد ہے

صحیح اور اعلیٰ ترین نصب العین کی خدمت ہی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک صاحبِ ایمان اپنی فطری خواہشات کی مناسب تسکین کے لیے تگ و دو کرے۔ ان فطری خواہشات کا تعلق نہ صرف اس کی زندگی کے بقا سے ہے، بلکہ یہ اس میں اور ابنائے نوع میں خالقِ حقیقی اور نصب العین سے محبت و عشق کی افزونی کے لیے بھی ضروری ہیں۔ لیکن چونکہ ان فطری جبلّی خواہشات کی تکمیل لذّت کا باعث بھی ہوتی ہے اور ان میں صحیح نصب العین کے تقاضوں سے بالعموم تصادم کا رجحان بھی ہوتا ہے، اس لیے ایک صاحبِ ایمان شخص کو ان اندھی اور بگ ٹٹ خواہشات کو ایک مناسب حد تک پُورا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ماہِ رمضان کے روزے اسی قسم کی تربیت کے سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک ماہ کے دوران روزے انسان کو اپنی خواہشات اور جبلّی تقاضوں کو کنٹرول میں رکھنے کی زبردست مشق فراہم کرتے ہیں۔ لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ اپنی جگہ کوئی بھی جبلّی خواہش غلط یا بے مقصد نہیں ہے۔ اس لیے ان کو مکمل طور پر اور مستقلاً دبانا قطعاً نامناسب ہے۔ ہر جبلّی خواہش کا بقائے انسانی اور عمومی ارتقاء میں اہم کردار ہوتا ہے اور صرف صحیح نصب العین کا تصور ہی ان کی جائز حدود کا تعین کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دنیا سے قطع تعلق، شادی بیاہ نہ کرنا اور عائلی زندگی سے اجتناب اور دوسری سماجی مشغولیتوں سے کنارہ کشی کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ جیسا کہ درج ذیل حکم سے معلوم ہوتا ہے اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔

اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ عیسائی راہبوں نے نفس کُشی کے جو طریقے اور رہبانیت کی جو روش اختیار کی، وہ ان کی اپنی ایجاد تھی۔ ان کے نبی نے انہیں اس کی تعلیم نہیں دی تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر عبادت اور زہد و تقویٰ میں غلو کرتے ہوئے اس بدعت کو شروع کیا:

وَرَهۡبَانِيَّةَ ۨابۡتَدَعُوهَا مَا كَتَبۡنَٰهَا عَلَيۡهِمۡ (الحدید: ۲۷)

اور رہبانیت کی تو انہوں نے خود ایک نئی بات نکال لی، ہم نے اسے ان پر واجب نہیں کیا تھا۔

فطری خواہشات، تقاضے اور جبلتیں خالقِ حقیقی کے نظمِ تخلیق کا اہم حصہ ہیں اور ان کا مقصد انسانی بقاء وارتقاء میں مدد ہے۔ چنانچہ جبلتوں کا پورا کرنا خالقِ حقیقی کے پروگرام میں معاونت کے مترادف ہے اور ان کی تردید یا مخالفت خدا کے عمل تخلیق اور ارتقاء کی مخالفت جملہ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد یہ نہیں رہا کہ وہ انسانوں کو اپنی فطری اور جبلی خواہشات کو کچلنا اور دبانا سکھائیں، بلکہ ان کا مقصدِ بعثت انسانوں کی جبلی خواہشات اور فطری تقاضوں کی تسکین کو صحیح نصب العین کی حدود میں مقید کرنا تھا تاکہ وہ نصب العین کو نقصان کی بجائے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر پورا کریں اور اس کے حصول میں ممد ہوں۔ جبلی قوتوں کا صحیح اور جائز استعمال نہ صرف مستحسن ہے انسانی معاشرے کی ترقی اور نمو میں یہ انتہائی مثبت اہمیت کی حامل ہیں۔

## عائلی زندگی کی اہمیت اور اعزہ و اقارب کے حقوق

جبلی تقاضوں میں سے جنسی جذبہ اسلام میں مناکحت کی شکل میں بھرپور تسکین حاصل کرسکتا ہے۔ نکاح سے ایک مرد دوسروں سے کئی رشتے اختیار کرلیتا ہے۔ مثلاً وہ بیٹا، بھائی، داماد، شوہر، باپ، چچا، سسر وغیرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح عورت، بیٹی، بہن، بہو، بیوی، ماں، خالہ یا چچی، خوشدامن وغیرہ ہوتی ہے۔ ان تمام رشتوں کے اعتبار سے ہر مرد اور عورت کے صحیح نصب العین کے ضمن میں متعدد حقوق و فرائض ہوتے ہیں۔ بالخصوص فرائض کی بجاآوری ایمان کے تقاضوں میں سے اہم فرض ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک مومن کو کوئی بھی اچھا اور نیکی کا کام اپنے قریب ترین عزیز و اقارب سے شروع کرنا چاہیے۔ جو بھی خونی طور پر زیادہ قریب ہے اس کا حق بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ تاہم یہ خیال رہنا چاہیے کہ ایک ہی درجے کے قرابت داروں کے درمیان کوئی فرق و تفاوت نہ ہو اور اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ چنانچہ دین نے اس معاملے میں بھی فطری

تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ چونکہ انسان طبعاً اپنے قریب ترین خونی رشتہ داروں سے زیادہ محبّت کرتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے انہی کے حقوق بھی زیادہ رکھے ہیں۔ ایک سلیم الفطرت اور نیک انسان کا دائرۂ خیر قریبی عزیزوں سے بڑھ کر پوری انسانیت کو محیط ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ ایثار اور قربانی کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کرتا ہے۔ ہمارے دین کی تعلیمات میں قرابت داروں کے حقوق کے بارے میں بڑی تاکید ملتی ہے۔ چنانچہ قریبی رشتہ داروں اور اہلِ خانہ سے محبّت اور اچھے سلوک کی تعلیم پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے متعدد اقوال میں دی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

اِبْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ (بخاری)

(خرچ کرنے میں) اُن سے ابتدا کرو جو تمہارے زیرِ کفالت ہیں۔

اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی خونی رشتے جب حق اور انصاف کے تقاضوں سے متصادم ہوں تو ان کی کوئی اہمیّت باقی نہیں رہتی۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں نے دینِ حق کے سلسلے میں کسی کی پرواہ نہیں کی۔ قریب ترین اور محبوب ترین عزیزوں کی محبّت بھی دینی تقاضوں کے تابع رہی۔ دین کا غلبہ اور صحیح نصب العین سے سچّی محبّت کا اظہار اس کے بغیر ممکن بھی نہ تھا۔
(جاری ہے)

---

## بقیہ: درس سورۂ محمّد

بلکہ یہی قولِ معروف ہو کہ: سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا۔ زیرِ مطالعہ آیت میں آگے فرمایا: فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ "جب ایک بات قطعی طور پر طے ہو جائے ...... فیصلہ ہو جائے" ...... یہ ہے دوسری مشاورت کا قصہ' جس کا حوالہ دیا جارہا ہے۔ ٹھیک ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے سامنے بات رکھ دی تھی جس کے نتیجہ میں طے ہو چکا ہے کہ لشکر کارخ کیا جائے گا۔ تو اگر کسی کی رائے اس اجتماعی فیصلہ کے خلاف ہو تب بھی نظم اور اجتماعیت کا تقاضا یہ ہے کہ اب کسی قسم کا کوئی تردّد و تذبذب نہ ہو' اسے پوری خوش دلی سے قبول کیا جائے اور اللہ کے بھروسہ پر اسی کے مطابق عمل و اقدام کیا جائے...... فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ○ فیصلہ ہو جانے کے بعد لوگوں کے لئے خیر اور بھلائی کا راستہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرنے میں ہی ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ "اگر اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لئے بہتر تھا"
بارک اللہ لی فی القرآن العظیم و نفعنی و ایاکم بالآیت و الذکر الحکیم
(جاری ہے)

محمد رضی الاسلام ندوی

(آخری قسط)

# مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۃ الفیل

## ——— ایک جائزہ

(بشکریہ ماہنامہ 'حیاتِ نو' بھارت)

## قرآنی الفاظ اور اسالیب سے استشہاد

(۱) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے لفظ "ترمی" سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ترمی کا فاعل ہمارے نزدیک قریش ہیں جو "الم تر" کے مخاطب ہیں۔ فعل "ترمی" چڑیوں کے لئے کسی طرح موزوں ہے ہی نہیں۔ چڑیاں اپنی چونچوں اور چنگلوں سے سنگ ریزے تو گرا سکتی ہیں لیکن رمی نہیں کہہ سکتے۔ رمی صرف اسی صورت میں ہوگی جب پھینکنے میں بازو یا ناخن کا زور استعمال ہو یا ہوا کے تیز و تند تھپیڑے اس کے ساتھ ہوں۔" ۳۲

مولانا اصلاحی کے آخری جملے سے خود ان کے اعتراض کی تردید ہو رہی ہے۔ ابو قیس بن اسلت یثربی جاہلی کے جو اشعار اوپر گزرے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ "جس وقت خدائی فوجوں نے لشکر ابرہہ کو پسپا کیا اس وقت تند و تیز ہوا بھی چل رہی تھی" اس لئے چڑیاں جب اوپر سے پتھر گراتی تھیں تو تیز ہوا کی وجہ سے ان میں رمی کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ مشہور محدث ابن ابی حاتم کی نقل کردہ روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے:

"عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اڑتے ہوئے لشکر پر چھا گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں پرندوں کا زبردست لشکر پرے کے پرے باندھے ہوئے ہے۔ ان کے منہ اور ان کے دونوں پنجوں میں سنگریزے تھے۔ انھوں نے اوّل تو آواز کی اور پھر لشکر پر سنگریزے مارنے لگے۔ ساتھ ہی تند و تیز ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگباری کو لشکر کے لئے مصیبتِ عظمیٰ بنا دیا۔" ۳۳

---

۳۲ تدبر قرآن ص ۵۶۴۔ ۳۳ قصص القرآن، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سوم ص ۲۶۸